ضروری ہے وہ باضابطہ نظام حکومت ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے پرانے وقتوں میں لوگ قبائل میں منقسم تھے اور عام طور پر طوائف الملوکی ہی ہوتی تھی۔ اور باضابطوں سلطنتوں کی حدود بھی بوجہ ذرائع آمدورفت کے معدوم ہونے کے وسیع نہ تھیں۔ صنعت وتجارت کے لیے تیسری چیز قیام امن ہے۔ تاریخی طور پر یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ پچھلے زمانے میں باقاعدہ پولیس فورس بھی نہ تھی ایسی صورت میں راستوں کا پُرخطر ہونا اور رہزنوں اور ڈاکوؤں کے خوف وخطر کا سر پر سوار رہنا نہایت لازمی بات تھی۔ علاوہ ازیں راستوں میں ٹھیرنے اور پڑاؤ کرنے کے لیے بھی انتظامات نہ ہوتے تھے۔ چوتھی چیز جو فروغِ تجارت کے لیے لازمی ہے وہ ایسی مشین ہے جس سے چیزیں بڑے پیمانے پر تیار ہوسکیں۔ یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ زمانۂ سلف میں تیزی سے کام کرنے والی کوئی مشینری نہ تھی۔ لوگ صنعت وحرفت کا کام معمولی اوزاروں کے ساتھ ہاتھوں سے ہی کیا کرتے تھے۔ لہٰذا کسی چیز کا بڑے پیمانے پر تیار ہونا ناممکن تھا۔ پانچویں چیز جو صنعت وتجارت پر بہت حد تک اثرانداز ہوسکتی ہے وہ سرمائے کا اجتماع ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم پرانے زمانے کی طرف جائیں سرمائے کا اجتماع کم ہوتا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ خیال کرسکتے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جو لوگ زیادہ دولت مند ہوں گے ان کے پاس بھی کتنی زیادہ دولت ہوگی۔ سرمائے کا اجتماع زیادہ طور پر اس وقت ہوا ہے جب سے بنکنگ سسٹم جاری ہوا ہے۔ اور دراصل تب سے ہی باضابطہ سودخوارانہ نظام کی بنیاد قائم ہوئی ہے اور تب سے ہی اس نظام کی بڑی خرابی یعنی ایک طرف بے انتہا تونگری اور دوسری طرف انتہائی غربت پیدا ہوئی ہے۔

اب پرانے زمانے کے بالمقابل آج کل کے سلسلۂ مواصلات، ذرائع آمدورفت، باربرداری کے سامان، نظامِ حکومت، قیامِ امن، تحفظ مسافراں، آٹومیٹک مشینری، راستوں کی سہولتیں اور دیگر تجارتی انتظامات مثلاً بیمہ کمپنیاں اور گڈز فارورڈنگ ایجنسیوں اور سرمائے کی اجتماعی صورت یعنی بنکنگ وغیرہ پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔ اُس وقت کی تجارت ایک کٹھن کام تھا جس کو دلیر، بہادر اور خدمتِ خلق کا جذبہ رکھنے والے لوگ ہی کرسکتے تھے۔ اسی لیے اس وقت تجارت کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ آج کل کی تجارت محض روپے کا کھیل ہے۔ اُس وقت تجارت کا مطلب تھا راستوں کی صعوبتیں جھیل کر ایک شہر سے دوسرے

نہیں لیتے ؟ کہیں "فقہ" کا لفظ لاتا ہے مثلاً لھم قلوب لایفقھون بھا۔ یہ منکرین دل رکھنے کے باوجود سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ کسی جگہ "بصیرت" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے جیسے افلا تبصرون۔ تم بصیرت سے کام نہیں لیتے ؟ کسی مقام پر اسی مفہوم کو لفظ "تدبر" سے ادا کرتا ہے مثلاً افلا یتدبرون القرآن۔ یہ لوگ قرآن پر غور و فکر نہیں کرتے ؟ اس کا اگلا ٹکڑا یوں ہے : ام علی قلوب اقفالھا ؟ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں ؟ مطلب یہ ہے کہ سمجھ بوجھ اور غور و فکر سے الگ وہی ہو سکتا ہے جس کے دل پر تالا پڑا ہو۔ اور اس حقیقت کو بار بار قرآن میں "حکمت" کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل کے بغیر حکمت نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ نعمت ہے جس کی تعلیم قرآن کے ساتھ ساتھ حضورؐ کے سپرد کی گئی ہے (یعلمھم الکتب والحکمۃ) حضرت لقمان کو حکمت عطا کی گئی (ولقد اٰتینا لقمان الحکمۃ) اور ہمارے خیال میں حُکم (قوتِ فیصلہ) بھی حکمت و عقل ہی کا نتیجہ ہے اور یہ بھی وہ نعمت ہے جو انبیاء کو عطا ہوئی۔ واٰتیناہ الحکم صبیا (ہم نے یحییٰ کو قوتِ فیصلہ دی)۔ یہ ایک جگہ تو اس مفہوم کو دوسرے انداز سے یوں ادا فرمایا ہے کہ: والذین اذا ذکروا بآیت ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا۔ خدائے رحمٰن کے بندے تو وہ لوگ ہیں کہ جب ان آیاتِ ربانی کی تلاوت کی جاتی ہے تو اس پر بہرے گونگے بن کر نہیں گر پڑتے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کلام ربانی پر ان کا ایمان ہے اسے بھی بے غور و فکر بہرے گونگے کی طرح نہیں سن لیتے بلکہ وہاں تدبر، تفقہ، غور، فکر، عقل، بصیرت، فہم، فراست اور حکمت سے کام لیتے ہیں۔ ایمان رکھنے کے باوجود تفقہ و تدبر کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے معانی کی گہرائیوں پر، حکمتوں پر، اسباب و علل پر، مقصد و روح پر، انطباق پر اور تمام دوسرے متعلقات پر غور و فکر کرتے ہیں اور اس سمندر سے نئے نئے موتی تلاش کر کے نکالتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قرآن محض جامد قسم کا نہیں بلکہ ایسا ایمان پیدا کرنا چاہتا ہے جو عقل و فہم اور تفقہ میں ہر روز نیا اضافہ کرتا چلا جائے۔ یعنی ایمان عقل پیدا کرے اور وہ عقل ایمان میں مزید پختگی کی تخلیق کرے۔ اور زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہیے کہ قرآن بے وقوف بننا نہیں سکھاتا بلکہ ایسی عاقل ترین امت پیدا کرنا چاہتا ہے جس کی عقل و فرزانگی زندگی کے ہر گوشے میں ارتقا پذیر ہو۔ ایمان عشق ہے اور عقل اس کی راہنما۔ نرا عشق اندھا ہوتا ہے اور نری عقل ابلیسیت ہے:

نی شناسد ہر کہ از سر محرم است　　　زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

ایک حدیث

عبادت و عقل کا باہمی ربط

ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب الاذکیا میں سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت یوں نقل کی ہے:

عن بن عباس انہ دخل علی عائشۃ فقال یا ام المومنین ارأیت الرجل یقل قیامہ ویکثر رقادہ واخر یکثر قیامہ ویقل رقادہ ایھما احب الیک؟ قالت سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما سألتنی عنہ۔ فقال احسنھما عقلا۔ قلت یا رسول اللہ اسألک عن عبادتھما فقال یا عائشۃ: انما یسئلان عن عقولھما۔ فمن کان اعقل کان افضل فی الدنیا والاخرہ۔

(کتاب الاذکیا۔ مطبوعہ مصر ص۲)

عبداللہ بن عباس ایک بار حضرت عائشہؓ کے پاس گئے اور پوچھا کہ: اے ام المومنین! ذرا بتلایئے کہ ایک شخص شب بیداری کم اور آرام زیادہ کرتا ہے۔ اور دوسرا شب زندہ داری زیادہ اور آرام کم کرتا ہے۔ آپ کو ان دونوں میں کون زیادہ پیارا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ جو سوال تم نے مجھ سے کیا ہے یہی سوال میں نے آنحضرتؐ سے کیا تھا تو حضورؐ نے جواب دیا کہ جس کی عقل زیادہ اچھی ہو وہی زیادہ محبوب ہے۔ میں (عائشہؓ) نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں تو ان کی عبادت کے بارے میں دریافت کر رہی ہوں (نہ کہ عقل کے بارے میں) حضورؐ نے فرمایا کہ اے عائشہ! ان دونوں سے ان کی عقلوں کے بارے میں بازپرس ہوگی۔ لہذا جو زیادہ عاقل ہوگا وہی دنیا اور آخرت میں افضل بھی ہوگا۔

اس حدیث کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اس کے بعد آیئے ہم سب لوگ اپنی عبادتوں اور اپنی عقلوں کا جائزہ لیں۔ لیکن پہلے قرآن پاک پر ایک نظر اس زاویہ سے ڈال لیجیے کہ یہ عقل کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن نے بار بار عقل سے کام لینے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے کہیں "عقل" کا لفظ استعمال کرتا ہے جیسے افلا تعقلون؟ تم عقل سے کام